Majallah Tahqiq
Research Journal of the
Faculty of Oriental Learning
Vol: 39, Sr.No.111, 2018 pp 95 - 105

مجلّہ تحقیق
مجلّہ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد۳۹، اپریل۔ جون ۲۰۱۸ء، شمارہ ۱۱۱

غالب: دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

☆ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

Abstract:

Mirza Asadullah Khan Ghalib is that blooming flower of the garden of confabulation whose brilliance and florescence is intensifying with the passage of time. Along with innumerable claddings of the greatness of Ghalib, the eternity of his worth can be realized by his wit, imperishable creative coquetry, abiding perversity and perpetual vivaciousness. We see that Ghalib's whole domestic and social life is existent of excessive problems and deficient resources on every step. These problems and calamities revolves around his personal, literary, social and emotional life. Political promiscuousness of subcontinent was an addition to his miseries.

This is the reason that he laments on his afflictions in letters to his beloved ones but his intervening of delicacy and humor makes his reader falls in love even with his miseries.

He not only mocks on the unevenness of the society but also ridicules on his self by diverse acerbity and style. This gesture obviously demands a great deal of morale, humorous and aesthetic sense. World knows that nature has bestowed upon him with these qualities to a large extent.

This research paper tries to deal with the sketches of the above-mentioned unique aspects of Ghalib's life.

دوستو! خوشی اور غم، ہنسنا اور رونا، قہقہہ اور نوحہ جیسے الفاظ بھلے آپس میں کتنا ہی اختلاف رکھتے

☆ پروفیسر شعبہ اُردو، ایف۔سی کالج یونیورسٹی لاہور۔

ہوں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ان کا ساتھ کائنات جتنا پرانا ہے۔ یہ زندگی میں ساتھ ساتھ نہ بھی چل سکیں تو ان کو اوپر تلے اور آگے پیچھے نزول کرنے سے روکنا ممکن نہیں۔ یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ کسی کی زندگی میں یہ لازم وملزوم کا روپ دھار کے آتے ہیں اور کہیں ظالم ومظلوم کے پیرہن میں ورود کرتے ہیں۔ تاریخ ترمیں اور زمانے بھر میں ان کی آنکھ مچولی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ جن قوموں کو وقت کی نبض پہ ہاتھ رکھنا آگیا، انھوں نے آسودگی بانٹنے اور آلودگی چھانٹنے، آسائشیں تقسیم کرنے اور آلائشیں تفریق کرنے کے بہتیرے طریقے دریافت کر لیے۔ جہاں تک برِصغیر کا تعلق ہے، یہاں تو خوشی اور غم کا تناسب ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہا۔ ازل سے اس دھرتی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ یہاں صدمے اجتماعی طور پر مسلط کیے جاتے ہیں اور لطافتیں انفرادی کاوش سے ہاتھ آتی ہیں۔ حادثوں کی برسوں باقاعدہ پرورش کی جاتی ہے اور خوشگوار گھڑیوں کے لیے تقدیر کے انتظار میں بال سفید کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خوشیوں سے وصل کی گھڑیاں پل بھر میں ہوا ہوتی جاتی ہیں اور المیے دہلیز پہ دھرنا دے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ کہیں کہیں تو صدیاں باہوں میں باہیں ڈال کے گریہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بہ قول شاعر:

میں کڑا وقت ہوں ٹلوں گا بھی تو رفتہ رفتہ
تو مسرت ہے گھڑی پل میں گزر جائے گی (ارشد نعیم)

برِصغیر میں قرن ہا قرن سے خوشیوں اور مسکراہٹوں پہ زوال کا ایک بڑا سبب یہاں کے حکمران رہے ہیں۔ اقتدار واختیار کا یہ عفریت خوشیوں کی فصلیں اور نسلوں کی نسلیں نگل گیا۔ منفی سیاست کے اس قضیے کو سمجھنے کے لیے معروف مغل حکمران اورنگ زیب سے متعلق انشاجی کا ایک زبان وزمان زدِعام قول بہت معاونت کرتا ہے جو فرماتے ہیں:

''اورنگ زیب عالم گیر بہت لائق اور متدین بادشاہ تھا۔ دین اور دنیا دونوں پر نظر رکھتا تھا۔ اس نے کبھی کوئی نماز قضا نہ کی اور کسی بھائی کو زندہ نہ چھوڑا۔'' (۱)

دوستو! یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ لیکن سچ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تو مغلیہ خاندان کے خدشات، واہمے، وسوسے، بے یقینی اور اقتدار واختیار کی ہوس ایسی شدت مزاج ہو چکی تھی اور ظرف کے پیمانے کی سبک سری اور کم مائیگی کا یہ عالم تھا کہ اقتدار شریک وزیر یا دودھ شریک بھائی تو رہے ایک طرف، حاکمِ وقت اپنے ہی عہد کے ایک ہنسوڑ کی محض ایک عددشرارت یا حقیقت آمیز پیروڈی کا بوجھ برداشت نہ کرسکا۔ اس نے کاندھوں سے بلند ہوتے سر کو گستاخی یا خطرے پہ محمول کیا اور اس طرح ہمارا اُردو کا پہلا مزاح نگار

(جعفرزٹلی) ایک مظلوم مگر خوف زدہ بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق:

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ تسمہ کش، فرخ سیئر (۲)

کہنے کی پاداش میں موت کا جھولا جھول گیا۔ حالات و واقعات وحادثات شاہد ہیں کہ اس کے بعد برِصغیر کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں ہنسنا ہنسانا تو درکنار لوگوں میں رونے رُلانے کی بھی تاب نہ رہی۔ یوں سمجھ لیں کہ اگلی ڈیڑھ صدی تک اُردو نگری میں:

جو اس زور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اور 'کفن سرکاؤ، بے زبانی ہماری دیکھتے جاؤ' والی کیفیت طاری رہی۔ حالات کے جبر نے لوگوں سے ظرف کا شرف چھین لیا اور ہر طرف حرف پہ برف جمتی دکھائی دینے لگی۔ پھر شاید قدرت کو برِ عظیم کے عوام پہ ترس آ گیا اور اِس خطے کے لوگوں کو زبان دینے کے لیے اسداللہ غالب اور فورٹ ولیم کالج اوپر تلے پیدا ہوئے۔ میرزا غالب، جس کے خون میں حرارت، شرارت اور جسارت اور مزاج میں جدت، حِدت اور شدت وافر مقدار میں بھر دی گئی تھی، جو نئے سے نئے روپ میں ان کی بے چین روح اور بے باک قلم سے قطرہ قطرہ ٹپکتی رہی۔ یہ ایسا انوکھا لاڈلا تھا جو اپنی عمر کی پون صدی کا لمحہ لمحہ وقت، زمانے اور حالات کے ہاتھوں مغلوب رہنے کے باوجود 'غالب' بنا رہا۔ روایتی داناؤں کا خیال ہے کہ مالی پسماندگی رفتہ رفتہ ذہنی پستی کا سبب بن جاتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ معاشی مفادات کی خاطر چاپلوسی اور کاسہ لیسی پہ اُتر آتے ہیں۔ تاریخ کی چھاتی پہ رقم ہے کہ کس مپرسی میں تو بڑے بڑے سورماؤں کے دُم اُگ آتی ہے۔ یہ شخص عمر بھر پائی پائی کو تر-ستا رہا مگر جگ ہنسائی اور روایتی دانائی کو ہمیشہ جوتے کی نوک پہ رکھا اور رفعتِ تخیل میں روز بہ روز غالب تر ہوتا چلا گیا۔

عجیب شخص ہے کہ گھر میں کھانے کو روٹی نہیں، بچے پہ بچہ مرے جا رہا ہے، چھوٹا بھائی پاگل ہو چکا ہے، عزیز از جان بھتیجا عین جوانی میں چل بسا ہے، یتیم بچوں کی پرورش کے بھاری بوجھ سے کمر شل ہے۔ دہلی کے مقیم ان کو شاعر ماننے کو تیار نہیں، استادِ شہ خاطر میں نہیں لاتا، کوتوالِ شہر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے، مشکل شاعری کے شکوے چین نہیں لینے دیتے، پنشن کا پرندہ دام میں آ کے نہیں دے رہا۔ ناقدریِ زمانہ کے مسائل اس پہ مستزاد ہیں، مگر یہ ہے کہ اس سب کچھ پہ چیں بہ جبیں ہونے کے بجائے خندہ زنی پہ مُصر ہے۔ جس بات پہ آنسو نکلنے چاہئیں، وہاں سے قہقہے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لوگ خطوط میں گالیاں لکھ کے بھیجتے ہیں تو آزردہ خاطر ہونے کی جگہ، اُن کی کم علمی پہ مسکرا کے اُن کی دشنام وری کی اِصلاح کرنے بیٹھ جاتا ہے:

''احمقوں کو اتنی خبر بھی نہیں کہ لڑکے کو ہمیشہ ماں کی، جوان کو بہن کی اور بوڑھے کو بیٹی کی گالی

دی جاتی ہے۔‘‘

بھائی کے پاگل ہونے کی خبر سن کر اصولاً تو خود کو بھی چل بہ چل ہو جانا چاہیے تھا، مگر یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ان حضرت نے تو ہر موقع پر جملہ چست کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

’’چلو اچھا ہوا آلامِ زمانہ کے احساس سے محفوظ ہو گیا۔‘‘

تاج کی سرزمین پہ آنکھ کھولنے والا اُردو کا یہ بے تاج بادشاہ غالب، غالباً پیدا ہی من مانیاں کرنے کے لیے ہوا تھا۔ یہ قدم قدم روایت شکنی پہ تُلا بیٹھا ایسا اوکھا لوگ تھا کہ اِس کا نہ طرزِ میر پہ دل پسیجا، نہ انیس کی آہ وزاری پہ آنکھ نم ہوئی، نہ نظیر کی آوارگی پہ لنگوٹ کس کے شریک ہوا اور نہ حسن و شنکر و شوق کی دل پشاوری کرنے والی مثنویوں نے توجہ کھینچی، نہ سودا کی قصیدگی دل میں اُتری اور نہ جرأت و انشا کی کشیدگی نے من پر چاپا۔ دوسری جانب فارسی ادب میں نہ حافظ کا خالِ رُخِ یار، دل میں تراز و ہوا اور نہ رومی و سعدی کی حکایت کاری نے باطن کو گداز کیا۔ پورے ادبی قبیلے میں آنکھ ٹکی بھی تو طرزِ بیدل پر۔

اہلِ دلی نے لاکھ سر پٹکا کہ میاں ہم سے زبان دانی کے رموز سیکھو کلکتہ والے چلّاتے رہ گئے کہ شاعری میں واقف و قتیل کی راہ اپناؤ لیکن فارسی و اُردو ادب کا یہ انوکھا لاڈلا ایک قدم کسی کے نقشِ پا پہ دھرنے کو تیار نہ ہوا اور روزِ اول سے نئی سے نئی راہیں تراشنے کی دُھن سر پہ سوار کر لی۔ مشکل پسندی کے خارزار میں اُترا تو بھی خواہشِ قلبی کی بنا پر اور سہل سازی کی پگڈنڈی دکھائی دی تو بھی دل کی آواز پہ لبیک کہا۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مخمس، مسدس، مثمن کی مقبولیت پہ لات مار کے غزل کی راہ چُنی تو بھی اپنی رضا سے اور جب غزل کی تنگنائی کا احساس جاگا تو اپنے بیان کی وسعت کی خاطر خطوط نگاری کا دامن بھی اپنی من مرضی سے تھاما۔

کہتے ہیں ہر فن کار کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے جو اُسے نئے سے نئے مضامین سجھانے اور رواروی کی دنیا سے ذرا فاصلے پہ رکھنے میں معاونت کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے اندر کا یہ بچہ، توانا، انجانا اور کہیں نچلا نہ بیٹھنے پہ مُصر ہے۔ وہ نہ صرف شہرت و مرعوبیت سے بے گانہ ہے بلکہ نٹ کھٹ اور شریر بلکہ پرلے درجے کا ظریف بھی ہے، جو قدم قدم پہ مشکل کو اُشکل میں بدلنے کے ساتھ ساتھ ہر موقع و محل کے مطابق نئی سے نئی پھلجھڑیاں چھوڑنے سے بھی باز نہیں آتا۔ بہت سے داناؤں کا عقیدہ ہے کہ مزاح، زندگی کو سہنے، رہنے اور ہنسی ہی ہنسی میں کچھ کہنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ یوسفی جی کا فرمان ہے کہ:

’’مزاح کوئی شخص لکھ نہیں سکتا جب تک کہ اس نے اپنے موضوع یا ہدف سے جی بھر کے اور رَج کے محبت نہ کی ہو۔ محبت شرطِ اول ہے۔ طنز میں یہ قطعی ضروری نہیں۔ طنز میں ایک تنفر، ایک بے گانگی سے ابتدا ہوتی ہے کہ میرے گرد جو کچھ ہو رہا ہے مَیں اُس کا حصہ نہیں ہوں اور مَیں اپنے آپ کو، اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں پاتا۔‘‘ (۳)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''میرا اپنا عقیدہ ہے کہ وہ مزاح جو آپ کو سوچنے پر مجبور نہ کرے وہ ناپُختہ ہے۔''(۴)

غالب کو دلی اور دل کی تمام تر بدحالی کے باوجود اپنے شہر، اپنے لوگوں اور اپنے فن سے اسی 'جی بھر کے محبت' نے زندہ و تابندہ رکھا۔ انھوں نے ہر طرح کے حالات، واقعات حتّٰی کہ اپنی ذات تک کو قہقہوں میں اڑانے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ شاعرِ مشرق نے ان کی اسی لطیف بیانی، شوخ زبانی اور لن ترانی کی بنا پر فرمایا تھا:

لطفِ گویائی میں تری ہم سری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
زندگی مُضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جُنبش ہے لبِ تصویر میں(۵)

یہ سب جانتے ہیں کہ لوگوں کے اوپر ہنسنا اور اردگرد سے قہقہے Creat کرنا دنیا کا سب سے آسان کام ہے، پطرس کے شاگردِ عزیز اور گورنمنٹ کالج لاہور ہی کے ایک فارغ التحصیل مزاح نگار کنھیا لال کپور کہا کرتے تھے:

''دوسروں کے اوپر ہنسنے کے لیے صرف ایک بتیسی کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ اپنے اوپر ہنسنے کے لیے بہت بڑا ظرف اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔''

قدرت نے غالب کو یہ ظرف اور حوصلہ نہایت وافر مقدار میں عطا کیا تھا۔ آج ہمارے جملہ ناقدین اس بات پہ متفق ہیں کہ غالب کے کلام میں فلسفہ ہے لیکن اقبال کے معنوں میں نہیں...... پیغام ہے لیکن حالی اور اکبر کی طرح نہیں......شوخی و ظرافت بھرپور انداز میں موجود لیکن ان کی عظمت کی نشانی یہ ہے کہ وہ آپ اپنا مذاق اڑانے کے جذبے سے پوری طرح سرشار اور ہمہ وقت تیار ملتے ہیں۔ پہلے ذرا ان کی شاعری سے شوخی، شرارت اور ظرافت کے چند نمونے ملاحظہ کریں:

چاہتے ہیں خوب روؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی !!

مَیں نے کہا کہ ''بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی''
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ''یوں؟''

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم !!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

کیا خوب ! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
رویے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے(۶)

یہ تو رہی ان کی دنیاداری کی شاعری، یہاں تو اکثر شعرا کے ہاں کہیں نہ کہیں شرارت وحرارت کی رمق دکھائی دے جاتی ہے لیکن مجھے تو ان کے مرثیے میں بھی ایک عجب انداز کی چھیڑ چھاڑ، شرارت اور تمسخر کا انداز ملتا ہے۔ مرثیہ بھی کوئی رسمی یا فرمائشی انداز کا نہیں بلکہ اپنے اکلوتے اور لاڈلے لے پالک زین العابدین عارف کا، ذرا تیور دیکھیے:

آئے ہو کل ، اور آج ہی کہتے ہو کہ ''جاؤں؟''
مانا کہ ہمیشہ نہیں ، اچھا ، کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور(۷)

ابھی چھیڑ چھاڑ کا یہ سلسلہ جاری تھا، زندہ دلی کی فصل اُگنے کی امید پیدا ہو چلی تھی کہ اتنے میں ۱۸۵۷ء کا سیاپا حلق پھاڑ کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن مرزا کی فطری ذکاوت نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ آیئے ذرا ان کے مکاتیب میں جابہ جا بکھری بشاشت اور فکاہت کی کچھ جھلکیوں پہ بھی نظر کریں اور دیکھیں کہ کس طرح وہ اپنے ذاتی حالات وواقعات وحادثات کو ہنسی میں اڑاتے چلے جاتے ہیں، ایک جگہ خبردار کرتے ہیں:

''اپنا نام بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔''(۸)

ایک اور مقام پہ تشبیہ و تجنیس کی آڑ میں دیکھیے کیا مزے دار صورت پیدا کی ہے:

''جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔'' (۹)

سب جانتے ہیں کہ آم غالب کا پسندیدہ پھل تھا، آموں کے بارے میں وہ ایک ہی عقیدے پر عمل پیرا تھے کہ 'میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں' اگر کبھی ایسی عیاشی میسر آ جاتی تو اُن کی خوشی سنبھالے نہ سنبھلتی۔ اپنے ایک فارسی خط میں نواب مصطفیٰ خاں بہادر کی طرف سے ایسا ہی گراں قدر تحفہ موصول ہونے پر شکریے کے خط میں دیکھیے کیا بشاشت، کیا لطافت اور کیا بہجت پھوٹی پڑتی ہے۔ لگتا ہے روح میں اترتی ہوئی شادمانی ہے، تشکر و تفخر میں بھیگی ہوئی شادکامی ہے۔ انداز ملاحظہ ہو:

''طوطیانِ شیریں سخن کے ولی نعمت، ہنوز گلشن التفات کی گل باریوں کے باعث شش جہت میں بہارِ تازہ کی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں، یعنی صحیفۂ بہاریں کے ورود کی شادمانیاں فضائے دل سے رخصت نہ ہوئی تھیں کہ شجرِ مہر و محبت نے دوبارہ لطف و کرم کے ساتھ ثمر افشانیاں شروع کر دیں۔ آموں کے آٹھ ٹوکرے پہنچے اور میری آرزو خرامی پر آٹھ بہشتوں کے دروازے کھول دیے گئے۔

یہ پاکیزہ اور شیریں آم اے سبحان اللہ! شکل دیکھو تو دودھ سے دُھلے ہوئے اور سیرت کا خیال کرو تو شہد میں گھلے ہوئے۔ تازگی پر نظر کیجیے تو آبِ حیات کی لطافت کا گمان ہو اور یہ خیال گزرے کہ انھیں دمِ مسیح کے لطفِ تاثیر نے پرورش کیا ہے۔ اپنی شیریں صفات میں وہ شکر سے بڑھ گئے اور انھوں نے خسرو پرویز کا دل جیت لیا۔ غرض کہ آم اپنی پاکیزہ گوہری کے باعث ابر و باد کے خانوادے کی آبرو ہے اور اپنے حسن پیکر کے اعتبار سے دودمانِ شاخ و شجر کا چشم و چراغ۔'' (۱۰)

اب ذرا سی دیر کو اِن کا دل والا دکھڑا سنانے کا طریق بھی پیشِ نظر ہو۔ اپنی بدقسمتی و برگشتہ طالعی کی کیا دھاک بٹھائی ہے؟ جہاں سرخفگی و رنج ہائے بیش بہا کی بنا پر سینے سے جا لگنا چاہیے تھا، وہاں گردن فخر و اعتماد سے تنی ہوئی ملتی ہے، داستان گوئی کا یہ قرینہ ملاحظہ ہو:

''لو اب میری کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو (۱۱) میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض...... کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق

دلانے پر، ریذیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد اک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال، ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔(۱۲)

دوستو! ہم نے اپنی زندگی میں پدرم سلطان بود پہ فخر کرتے تو بہت سوں کو دیکھا اور سنا ہے لیکن اپنی نحوست کو گلیمرائز (Glamorise) کرنے کی ایسی مثال شاید و باید کہیں دکھائی دیتی ہو۔ اسی انوکھے فخر و انبساط کا سلسلہ تو کہیں رکنے ہی میں نہیں آتا۔ ذرا اس لن ترانی کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجیے:

''میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا...... میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں، نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔(۱۳) دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع، مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب مَیں جو والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں۔(۱۴)

ہر غم، ہر رویے، ہر چیز کو ہنسی میں اڑانے کی یہ جرأتِ رندانہ ہی دراصل، اسد اللہ خان کو 'غالب' کے مرتبے پر فائز کرتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے صدمات پہ رنجیدہ و کبیدہ خاطر نہ ہونے کا سبب، اور ہر حال میں شادمانی و شادکامی کا فلسفہ اپنائے رکھنے کی منطق بھی انھی کی زبان سے سن لی جائے، فرماتے ہیں:

''سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو...... بھئی ''مغلچے'' بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی ''مغلچہ'' ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مَیں نے بھی مار رکھا ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو،

شہد کی مکھی نہ بنو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامتِ جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہَے ہَے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشمِ بددور، وہی ایک حور!!" (۱۵)

اپنے ادبی معیار کا وہ ہَوکا کہ اسد نام کے کسی اور شاعر کا شعر سنا تو اپنا تخلص ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر لیا۔ پھر تمام عمر پرانے بلکہ اصل نام کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ کسی واقف کار نے انجانے میں دوسرے اسد کے شعر کو ان سے منسوب کر کے تعریف کر دی تو دیکھیے کیسا کرارا جواب دیتے ہیں:

"ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی ان سے کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسدؔ ہو گزرے ہیں۔ یہ غزل ان کے کلامِ معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے، ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ تم طرزِ تحریر اور روشِ فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف! (۱۶) میرا ہم قوم تو سراسر قلمروِ ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یادشتِ قپچاق!! (۱۷)

آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ جس شخص کے مرتے دم تک یہ تیور ہوں کہ:

"ستر ابہترا" اردو میں ترجمہ پیر "خرف" ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے، پس میں "اخرف" ہوا، گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ (۱۸) پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضا پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوزِ غم ہائے نہانی علاوہ...... سوائے شہرتِ خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسنت" و "مرحبا" کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر، ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ (۱۹)

"آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترھواں برس مجھے جاتا ہے، ہائے:

سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس

بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس(۲۰)

ایک شعر میں نے بہت دن سے کہہ رکھا ہے۔اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست مرثیہ لکھے تو اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔وہ شعر یہ ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد(۲۱)

ہمارے ہاں مذہبی و اخلاقی حلقوں میں اکثر 'موت کا منظر' پہ نہایت رقت انگیز قسم کی قیافہ آرائی کی جاتی ہے۔عام گنہگاروں کو 'مرنے کے بعد کیا ہوگا؟' کی تصویر دکھا کے خوف زدہ کیا جاتا ہے۔کمزور قلب لوگوں کی تو اس کے تصور ہی سے گِھگھی بندھ جاتی ہے۔غالب کو دیکھیے وہ تو اُس جہان کا نقشہ بھی اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ امکان پہ ایقان کا گمان ہوتا ہے:

''سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا کافر مرا۔ہم نے از راہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام گاہ، عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا۔''سقر مقر'' اور ''زاویہ ہاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔'' آیئے نجم الدولہ بہادر'' ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔میں ان سے پوچھ رہا ہوں:
اجی حضرت نواب صاحب!
نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب!
آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو اُکسو''؟
بولے کیا؟ بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا تھا۔یہ بھی تو سونچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا؟(۲۲)

مختصر یہ کہ میرزا کے شاگردِ خاص اور اُردو دنیا کے پہلے غالب شناس مولانا الطاف حسین حالی نے آج سے ڈیڑھ سو سال قبل غالب کے مغلوب یا مرحوم ہو جانے پر جو مرثیہ رقم کیا تھا، اس سے بہتر خراج شاید ہی غالب کو آج تک پیش کیا گیا ہو۔وہ تحسین آج بھی اتنی ہی باوقعت اور پُر تاثیر ہے، لہٰذا مَیں اپنا یہ مضمون حالی کے اسی مرثیے کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں، جو فرماتے ہیں:

ایک روشن دماغ تھا ، نہ رہا
شہر میں اِک چراغ تھا ، نہ رہا

☆☆☆

حواشی

نوٹ: اس مضمون میں شامل غالب کے تمام اُردو خطوط کے اقتباسات ''خطوطِ غالب'' مرتبہ: غلام رسول مہر مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء (اشاعت چہارم) سے لیے گئے ہیں۔

۱۔ ابنِ انشا، عالمگیر (مضمون) مشمولہ: اُردو کی آخری کتاب، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء، (۲۶واں ایڈیشن) ص: ۴۷

۲۔ جعفرزٹلی، زٹل نامہ (کلیاتِ جعفرزٹلی) مُرتّب: رشید حسن خاں، انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۳ء ص: ۱۵

۳۔ مشتاق احمد یوسفی (انٹرویو: آصف فرخی) مطبوعہ: قومی زبان، دسمبر ۲۰۱۸ء، ص: ۹۸

۴۔ ایضاً، ص: ۹۷

۵۔ علامہ محمد اقبال، نظم 'غالب' مشمولہ: بانگِ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۸

۶۔ دیوانِ غالب، فضلی سنز، کراچی، ۲۷ دسمبر ۱۹۹۷ء، صفحات بالترتیب: ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۱۶، ۲۸، ۱۵۵، ۱۳۷، ۱۱۵، ۱۹۸

۷۔ عارف کا مرثیہ، دیوانِ غالب، ایضاً ص: ۶۹۔۷۰

۸۔ مکتوب نمبر ۴۹ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۸۸

۹۔ مکتوب نمبر ۱۷ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۹۴

۱۰۔ فارسی مکتوب نمبر ۷۰ بنام: مصطفیٰ خاں بہادر، مشمولہ: غالب کے فارسی خطوط (مترجم و مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)، بک کارنر، جہلم، فروری ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۲

۱۱۔ مکتوب نمبر ۹ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۳۲

۱۲۔ مکتوب نمبر ۱۶ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۵۔۴۱۶

۱۳۔ مکتوب نمبر ۶ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۵۲۔۵۳

۱۴۔ مکتوب نمبر ۱۶ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۵۔۴۱۶

۱۵۔ مکتوب نمبر ۱۹۔۲۰ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۹۶۔۱۹۷

۱۶۔ مکتوب نمبر ۲۰ بنام: منشی شیونرائن آرام، ص ۲۱۳

۱۷۔ خفچاق، ترکستان کی ایک صحرانشین قوم کا نام، وہ جس علاقے میں قیام پذیر تھی، اسے دشتِ خفچاق کے نام

سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۸۔ مکتوب نمبر ۱۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۹۳

۱۹۔ مکتوب نمبر ۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۸۵

۲۰۔ مکتوب نمبر ۱ بنام: صفیر بلگرامی، ص ۵۲۷

یاد رہے کہ مرزا غالب کے اس شعر کے جواب میں صفیر بلگرامی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ:

سنا صفیرا، یہ کہتے ہیں حضرتِ غالبؔ
بہت جیوں تو جیوں اور پانچ چار برس
مگر یہ پہلے سے امدادِ غین کی ہے دعا
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

۲۱۔ مکتوب نمبر ۱ بنام: سید مقبول عالم، ص ۴۳۵

۲۲۔ مکتوب نمبر ۱ بنام: مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ، ص ۹۶